حضرت مولانا مولوی محمود حسن نور اللہ مرقدہٗ

کے

اذکار مبارکہ

بہ قلم

یکے از مخلصین یعنی

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب قدس اللہ سرہٗ

ناشر

مجلسِ یادگارِ شیخ الاسلام - پاکستان

کراچی

عن بعض الصالحین عنہ ذکر الصالحین تنزل الرحمۃ

بنا بر عمل بریں مقولہ منقولہ، از زبان ثقہ مقبولہ، ایں تذکرہ سعادت
مشمولہ، و برکت محمولہ یعنی ذکر محمود العلماء و مقصود العرفاء راس
المحدثین مقدام العاشقین مولانا مولوی محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ

ملقب بہ

ذکر محمود

کہ دراں بر ترکیب توصیفی تلمیح است، و بر ترکیب اضافی تصریح
باسم گرامی شان آں بوجہ مجازت مبانی و جامعیت معانی گویا مرآتے ست
مجلوہ، برای تذکرہ مبسوطہ مرجوہ، بقلم یکی از مخلصین (یعنی حکیم الامت
مولانا اشرف علی صاحب دام ظلہم) نوشتہ شد

(و باہتمام احقر محمد شبیر علی عفی عنہ)

در مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون طبع کردہ شد

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رسالے "ذکر محمود" کی اشاعتِ اول (۱۹۲۱ء) کا سرورق

حرفے چند

حضرت شیخ الہندؒ کے سانحۂ وفات کے بعد قریبی زمانے میں لکھی جانے والی تحریروں میں جو تحریر کسی رسالے کی صورت میں سب سے پہلے شایع ہوئی تھی میری معلومات کے مطابق وہ یہی تحریر ہے اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے منفرد بھی ہے۔

(۱) کسی شخص کی وفات کے بعد جو تحریریں لکھی اور شایع کی جاتی ہیں ان میں رنج وغم، تعزیت، ہم دردی، مرحوم کی شخصیت کے اُٹھ جانے سے علم وفن کے نقصان، اخلاق وسیرت، تہذیب کے نشان مٹ جانے کے غم، پس ماندگان کو صبر کی تلقین وغیرہ کے مضامین ہوتے ہیں۔ اور جہاں کوئی قریبی رشتہ ہو — مثلاً: استادی شاگردی یا پیری مریدی کا تعلق ہو تو رنج وغم کے تاثرات زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت تھانویؒ کی اس تحریر میں ایسا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ جذبات سے دور مختلف واقعات کا تذکرہ ہے۔

۲- وجۂ تالیف سے بھی کسی قلبی تعلق کا پتا نہیں چلتا، صرف بعض اعزہ کی فرمایش کی تعمیل ہے، یا اس لیے کہ مقبولین کے تذکرے کا موجبِ برکت وسعادت ہونا معلوم ومسلم ہے۔ اس لیے بہ نام خدا یہ سطریں لکھی گئی ہیں۔

۳- حضرت شیخ الہندؒ تو ایسی شخصیت اور ایسے فضایل کا پیکر اور ایسے خصایص کا مجموعہ تھے کہ ایک عرصے تک ان کے غم میں آنسو بہائے جائیں اور ماتم کیا جائے، اور حضرتؒ کے فراق میں متبعین مخلصین پر ایسا ہی عالم گزرا تھا، لیکن حضرت تھانویؒ کے دامن پر شفیق استاد کے غم میں آنکھ سے ٹپکے ہوئے ایک آنسو کا سراغ بھی نہیں ملتا۔

۴- حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے سیاسی پہلو اور قومی وملّی خدمات کے

تذکرے سے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے قلم کو آلودہ ہونے سے بچایا ہے اور ———

۵- جوارِ بلدِ امین مکہ مکرمہ میں حضرتؒ کی مظلومانہ گرفتاری، جیزہ کی قید، مالٹا کے دارالمحن کی آزمایش پر ہم دردی اور تعزیت کے لیے حضرت تھانویؒ کے ذخیرۂ لغات میں ایک جملہ بھی نہیں نکلا!

۶- آخر میں مؤلف مرحوم نے خود اپنے باب میں حضرت شیخ الہندؒ کے بعض فرمودات جو رواداری، درگزر، ملاقات و گفتگو سے اعراض کے بارے میں درج فرمائے ہیں ان کے بارے میں شبہ ہے کہ ان کی روایات حضرت مؤلفؒ تک صحیح پہنچی ہوں گی! تاریخ اور عقیدے کے بارے میں رواداری کا کوئی مذہب نہیں۔ رواداری، درگزر اور اعراض معاشرتی زندگی اور اس کے معاملات کا حسن ہے اور اسے ضرور برتنا چاہیے کہ اس کے بغیر پرسکون زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اور دین کی دعوت وارشاد اور تزکیہ واصلاح کے لیے سازگار فضا پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن ان الفاظ کو بیانِ حق سے گریز اور سکوت کا پیراہن بنالینا ایمان کی جان کنی ہے!

۷- حضرت شیخ الہندؒ پر اپنے ہی شاگرد کو دعوتِ حق سے گریز سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید حضرتؒ کو اپنے عقیدے میں رسوخ نہ تھا! اور مؤلف مرحوم کے مسلک کو بھی حضرت نے گوارا فرمالیا تھا۔ حال آں کہ یہ ہرگز درست نہ تھا۔ مؤلف مرحوم کے فکر اور رویے کا حضرت شیخؒ نے نہایت واضح اور سخت الفاظ میں ابطال فرمایا ہے۔ یہاں صرف دو مثالیں کسی تبصرے کے بغیر پیش کی جاری ہیں؛

الف: تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کے بارے میں حضرت مؤلفؒ کے استدلال کے رد میں فرماتے ہیں:

> ''اس وقت جو خلجان بعض طلبا کو پیش آرہا ہے عہد نبوت میں بھی بعض مومنین کو پیش آیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کفار سے بالکل علاحدگی اور قطع تعلق

کس طرح ہوسکتا ہے؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو اپنے ماں باپ، اپنے بھائیوں اور سب خویش واقارب سے چھوٹ جائیں گے، ہماری تجارتیں تباہ ہوجائیں گی۔ ہمارے اموال ضایع ہوں گے اور ہماری بستیاں اجڑ جائیں گی۔ اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ عنایت فرمایا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآئُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (سورۂ توبہ: ۲۴)

"تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ رستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔"

کبھی دل میں یہ وسوسہ گزرتا ہے کہ یہ تحریکات جو ملک میں پھیل رہی ہیں خدانہ کرے کہ وہ ناکام ہوں اور گورنمنٹ اپنی ضد پر اڑی رہے تو ہم کو سخت ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے! اِس طرح کے معاملات اُس زمانے میں بھی پیش کیے گئے تھے۔ چناں چہ قرآن مجید میں ہے کہ

يَقُوْلُ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ. (سورۂ مائدہ: ۵۲)

کہتے ہیں کہ ہمارے دوستانہ تعلقات یہود کے ساتھ اس لیے ہیں کہ زمانے کی گردش سے کہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارادے ناکامیاب ہوں اور یہود غلبہ حاصل کرلیں تو اس وقت ہمارے لیے بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا:

فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ.

(سورۂ مائدہ:۵۲)

"قریب ہے کہ لے آئے اللہ تعالیٰ فتح یا اور کوئی بات اپنے پاس سے، پھر منافقین ان خیالات پر نادم ہو کر رہ جائیں گے جو ان کے دلوں میں چھپی ہیں۔"

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ فتویٰ مدرسۃ العلوم علی گڑھ (علی گڑھ کالج) کے طلبا کے استفتا کہ جواب میں ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت معلوم! یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کے فتاوے حضرت شیخ الہندؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ سے لکھوایا کرتے تھے۔ اگر اس فتوے کی تحریر میں بھی یہی طریقۂ کار استعمال کیا گیا ہو تو جان لینا چاہیے کہ حضرت تھانویؒ کے دو ہم درس اور استاد بھائیوں کے فکر و استدلال کار فرما رہے ہیں۔ حضرت علامہ عثمانیؒ کی مسئلۂ خلافت اور ترکِ موالات پر ایک زبردست تقریر بھی یادگار ہے، جس میں انھوں نے حضرت تھانویؒ کے خیالات اور وقت کے بہت سے خلجان اور وساوس و توہمات کی تردید کردی ہے۔

اوپر کے فتوے کا اقتباس "تذکرۂ شیخ الہند" سے لیا گیا ہے۔ تفصیلی مطالعے کے لیے اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ نیز یہ استفتا اور فتویٰ "شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ — ایک سیاسی مطالعہ" میں بھی شامل ہے۔

ب: تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات ہی کا زمانہ تھا، جامعۂ ملیۂ اسلامیہ (دہلی) کے تاسیسی اجلاس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اُٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے
نرغے سے بچاؤ! تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے! خدا کا
نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور اُن کے سامانِ حرب وضرب کا!
حال آں کہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے
قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے، اور
دنیا کی متاعِ قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی
حقیقت نہیں رکھتی۔"

اس اقتباس کے مشارٌ الیہ خانقاہِ تھانہ بھون کے مسند نشین کے سوا کوئی اور نہ تھا۔
ہمارے دل میں "ذکرِ محمود" کے مؤلف مرحوم کا بہت احترام ہے، لیکن ہم آں مرحوم کے خیالات کو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت، حضرتؒ کی بصیرت، سیاسی افکار اور حضرتؒ کی خدمات اور حضرتؒ کی تمام قومی و ملّی کارگذاریوں پر پانی پھیرے بغیر تسلیم نہیں کر سکتے اور ہم اس کے لیے تیار نہیں!

بہر حال اس مجموعے میں جہاں رنگا رنگ خیالات اور نوع بہ نوع تاثرات اور مضامین قارئین کرام کی نظروں سے گزریں گے اور حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے افکار و خدمات کے گوناگوں واقعات و تاثرات کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں گے وہاں زیرِ نظر رسالے "ذکرِ محمود" کی تحریر اور افکار کا مطالعہ بھی لطف و ذائقے سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کسی مجموعے کی تمام تحریریں ایک ہی طرز و اسلوب میں ہوں تو ان میں کیا مزا آ سکتا ہے؟ اس سادہ و بے نمک تحریر میں بھی حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت و سیرت کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ان کا انکار نہیں کر دینا چاہیے، اور کیا تعجب کہ ہمارے کسی محترم قاری کے ذوق کا معیار یہی رسالہ اور اس کے مضامین ہوں!

ابوسلمان شاہ جہان پوری

ذِکرِ محمود

ذِکرِ محمودؒ[1] از محمد شد حسن
حامدِ حق محسنِ اہلِ زمن

خطبہ:

بعد حمد وصلوٰۃ مجھ سے میرے بعض اعزّہ[2] نے فرمایش کی کہ کچھ مختصر تذکرہ اِمام العلماء، مقدامُ العرفاء، اُستاذی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کا لکھ دُوں۔ میں نے کافی واقعات وحالات پر محیط نہ ہونے کا عذر کیا۔ عزیز موصوف نے کہا: جیسا ''یادِیاراں'' میں حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے بعض متفرق ومختصر واقعات بہت ہی قلیل مقدار میں لکھ دیئے ہیں اسی انداز پر لکھ دیا جائے، پھر ہم لوگ اُس کے ساتھ خود منضم کرلیں گے۔ چوں کہ اس مقدار اور اس طرز میں لکھنے سے کوئی عذر نہ تھا، اور مقبولین کے تذکرے کا

---

(۱) یعنی ذِکر (مولانا) محمود (حسن) کا، سیّد العالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے (کہ مولاناؒ کو مثل جمیع مقبولین کے حضور سے حاصل ہے) حسن ہوگیا، اور مصرعۂ ثانیہ میں حامد اور محسن مع اپنے قیود کی صفتیں ہیں، محمود واقع مصرعۂ اُولیٰ کی اور معنی ظاہر ہیں، اور دونوں مصرعے مولاناؒ کے نام کی تصریح اور آپ کے تینوں بھائیوں کے ناموں کی طرف اِشارے پر مشتمل ہیں۔ (اشرف)

(۲) المراد به ابن اختی المولوی ظفر احمد جعله الله کما یحب ویرضی۔ (اشرف)

موجبِ برکت وسعادت ہونا معلوم ومسلّم ہے، اس لیے بہ نامِ خدا یہ چند سطریں لکھتا ہوں اور اس کا لقب ''ذِکرِ محمودؒ'' تجویز کرتا ہوں، جس کی دونوں ترکیبیں ہوسکتی ہیں، خواہ موصوف وصفت کہیے، خواہ مضاف ومضاف الیہ، اور اوّل اَولیٰ ہے مع اشارے کے ثانی کی طرف۔ واللهُ الْهَادِیُ اِلَی الصَّوَابِ وَهُوَ الْمُيَسِّرُ لِكُلِّ صِعَابٍ!

اور اس کے اجزا کو مع قیدِ عدد بہ عنوان ''ذِکر'' تعبیر کروں گا۔

اذکار

پہلی زیارت:

ذکر نمبر ۱: سب سے پہلے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت وصحبت سے مشرف ہوا وہ زمانہ تھا جس میں تحصیلِ درسیات کے لیے دیو بند کے مدرسۂ عالیہ میں حاضر ہوا، اور من جملہ اسباقِ مجوّزہ کے مُلاّ حسن اور مختصر معانی کا سبق مولاناؒ کے متعلق ہوا۔ یہ زمانہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) کا اَخیر تھا، یعنی ذی قعدہ کا مہینہ تھا۔ مولاناؒ اُس وقت مدرّسِ رابع تھے، اور مدرّسِ اوّل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مدرّسِ دوم حضرت مولانا سیّد احمد صاحب اور مدرّسِ سوم حضرت مولانا محمد محمود صاحب تھے، رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃً!

حضرت نانوتویؒ کی خدمت:

ذکر نمبر ۲: مولاناؒ اس وقت بالکل جوان تھے اور لباس بہت نفیس پہنتے تھے، اور بندوق سے شکار کا مشغلہ بھی بہ کثرت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا قاسم العلوم قدس سرہٗ بھی دیو بند تشریف فرما تھے، مدرسہ آپ کی سرپرستی میں تھا، درس سے فارغ ہوکر زیادہ وقت حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں صَرف فرماتے تھے۔

تقریر میں سلاست وارتباط:

ذکر نمبر ۳: مولاناؒ کی ذہانت اور فطانت تو خداداد فطری تھی ہی، اس پر شباب کے رنگ نے سونے پر سہاگہ کا کام دے رکھا تھا۔ اس قدر تیزی تھی کہ سبق شروع

ہونے کے وقت جس جگہ نشست ہوتی تھی ختم ہونے تک اس جگہ سے بہت آگے بڑھ آتے تھے، مگر تقریر میں باوجود تیزی وروانی کے سلاست اور اِرتباط اورترتیب اس درجے تھی کہ مفہوم کتاب کا آئینہ ہوجاتا تھا۔

نفسِ مطلب پر اِکتفا:

ذکرنمبر ۴: عادتِ شریفہ تقریرِ کتاب میں یہ تھی کہ اکثر نفسِ مطلب پر اِکتفا فرماتے تھے، جس کا نتیجہ کتاب کا جلدی نکلنا، کتاب سے طالبِ علم کو کامل مناسبت اور اس سے کامل اِستعداد ہوجانا تھا۔ حسن ووجازت ووضاحتِ تقریر میں مولاناؒ کا ثانی غالباً اب تک بھی ذہن میں نہیں ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ!

اسباق میں کیفیات:

ذکرنمبر ۵: مُتَعَسِّفَانَہ سوال کے مقابلے میں اِلزامی مُسکِت جواب تو ایسا ہوتا تھا کہ طالبِ علم منہ تک کے نقشِ دیوار کی طرح رہ جاتا تھا، اور اکثر ایسے جواب میں ایک لطیف مگر چبھتا ہوا مزاح بھی شامل ہوتا تھا، جو اِنتہا کی تہذیب کے ساتھ نفس کا پورا معالجہ ہوتا تھا۔

ذکرنمبر ۶: مذکورہ اسباق کے سلسلے میں احقر کے اسباق، فراغِ درسیات تک مولاناؒ کی خدمت میں رہے۔ معقولات میں حمداللہ، میرزاہد رسالہ، میرزاہد مُلا جلال اور حدیث میں متعدّد کتب جن کی تفصیل رسالہ سبع سیارہ میں ہے، اور فقہ میں ہدایہ آخرین تو اس وقت مولاناؒ سے پڑھنا یاد ہے، باقی شاید سوچنے سے یاد آجائے۔

ذکرنمبر ۷: معمول یہ تھا کہ جب طالبِ علم عبارت پڑھ چکتا تو لمبی سے لمبی

عبارت کا نہایت مختصر اور جامع خلاصہ ایسا بیان فرما دیتے کہ پھر طالبِ علم کو اس کی تفصیل کو سمجھ لینا آسان سے زیادہ آسان ہو جاتا۔ گویا اس تفصیل کا اس اِجمال پر منطبق کرنا ہی رہ جاتا ہے، اور مطلب سمجھنے میں ذرّہ برابر گنجلک نہ رہتی۔ یہ بھی من جملہ کمالاتِ خاصہ تھا۔

ذکر نمبر ۸: معمول مذکور نمبر ۷ کی یہ برکت تھی کہ کتابیں اس طرح جلد جلد ختم ہوتی تھیں، جیسے کوئی مشین میں ڈھالتا ہو، حتیٰ کہ ہدایہ آخرین کا ایک معتدبہ حصہ بلا ترجمہ ہی نہایت سہولت سے پڑھنا یاد ہے۔

ذکر نمبر ۹: حدیث میں گاہ گاہ تلامذہ کی درخواست پر خود بھی عبارت پڑھتے، جس کی روانی اور مفہم لہجے کا لطف مشاہدے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اور خوبی یہ ہے کہ درمیان درمیان ایسے وقفاتِ لطیفہ بھی ہوتے تھے کہ جس کا دِل چاہے اپنے شبہات وسوالات اطمینان سے حل کر سکے۔ اس حالت کے جوابات میں ایک خاص اِختصار اور اِسکات کی شان ہوتی تھی۔

مناظرہ:

ذکر نمبر ۱۰: احقر کو زمانۂ طالب علمی میں ہر فرقے کے ساتھ مناظرہ کرنے سے ایک خاص دِل چسپی تھی، جیسی اب اس سے اسی درجے نفرت ووحشت بھی ہے۔ دیوبند میں ایک بار عیسائی منادیوں کا ایسا سلسلہ لگا کہ مسلسل یکے بعد دیگرے آتے اور بازار میں تقریریں کرتے۔ احقر سنتے ہی پہنچتا اور گفتگو کرتا۔ ایک بار ایک بڑا پادری جو یورپین تھا، زیادہ مجمع وسامان کے ساتھ آیا اور ایک باغ متصل اسٹیشن میں خیمے نصب کر کے ٹھہرا۔ احقر مع چند طلبا کے وہاں بھی پہنچا اور اس سے گفتگو شروع کی۔ کسی نے حضرت مولاناؒ کو خبر پہنچا دی۔ اس شفقت کی کچھ حد ہے کہ صرف یہ خیال کر کے کہ کم عمر اور نا تجربہ کار ہے، کبھی مرعوب نہ ہو جائے،

خود اس باغ میں تشریف لائے اور مجھ کو ہٹا کر خود گفتگو شروع فرمائی۔ اس نے نام پوچھا، آپ نے فرمایا: ننھا! وہ معمولی آدمی سمجھ کر گفتگو کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ اس گفتگو میں یہ بھی تھا کہ اس نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں۔ مولاناؒ نے اس کی تفسیر پوچھی، تو وہ نہ بتلا سکا۔ اس میں مزاحاً یہ سوال بھی فرمایا کہ کلمے کے یہ اقسام ہیں، پھر ان اقسام کے یہ اقسام ہیں، عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کلمے کی کون (سی) قسم تھے؟ تو وہ منہ دیکھ رہا تھا اور جواب میں پریشان تھا۔ آخر اس کی میم (عورت) نے یہ حالت معلوم کر کے ایک رُقعہ بھیج کر اس کو بلایا اور اس نے جان چھڑا کر چلے جانے کو غنیمت سمجھا۔ ہم سب لوگ خوش بہ خوش مدرسے واپس آئے۔

تصانیف اور ترجمۂ قرآن:

ذکر نمبر ۱۱: اُسی زمانے میں مولاناؒ کو شغل تصنیف سے بھی دِل چسپی تھی، چناں چہ ''ادلۂ کاملہ'' کا جواب جو غیر مقلدین کی طرف سے موسوم بہ ''مصباح الادلہ'' لکھا گیا تھا، حضرت مولاناؒ نے اس کا جواب لکھا جو مطبوع بھی ہو گیا ہے، جس کا نام ''ایضاح الادلہ'' ہے۔ پھر مختلف زمانوں میں دُوسرے رسائل بھی لکھے، جن میں دو اس وقت یاد ہیں: ایک ''احسن القریٰ'' دُوسرا ''جہد المقل''۔ جن کی حسن وخوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اور سب سے اَنفع اور اَرفع تصانیف میں قرآن مجید کا ترجمہ ہے جو اَخیر عمر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں جن فوائد ولطائف کا اِلتزام واِہتمام فرمایا گیا ہے ان کی تحقیق وتفصیل اس کے مقدمے میں تحریر فرمائی گئی، جو میرے نزدیک وہ بجائے خود ایک مستقل رسالہ ہے۔ ایسا کہ اگر کوئی خاص صاحبِ علم مجموعہ ترجمے کو بھی نہ دیکھے تو خود اس مقدمے کو تو دیکھ لینا ضرور ہی ہے۔

ذکرِ تواضع

تواضع وخلوص کی صفت حق تعالیٰ نے ایک خاص ممتاز شان سے عطا فرمائی تھی، جس کے بعضے آثار یہ تھے جو یہاں سے نمبر ۲۲ تک مذکور ہیں۔

ذکر نمبر ۱۲: تلامذہ کے ساتھ اس طرح اختلاط وارتباط وانبساط رکھنا کہ دیکھنے والا کبھی نہ سمجھ سکے کہ یہ اس مجمع کے مخدوم ہیں۔

ذکر نمبر ۱۳: بعضے خدام کے ساتھ جن میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی، مثلاً: مولاناؒ کے کسی اُستاذ یا بزرگ کی اولاد میں سے ہونا، یا عوام مسلمین کے نزدیک معظم ہونا، وَنَحْوِ ذٰلِكَ اُن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اجنبی شخص کو شبہ ہو سکے خادم پر مخدوم ہونے کا۔ جب خدام کے ساتھ یہ معاملہ ہو تو مساوی یا بڑوں کے ساتھ معاملے کا اسی سے موازنہ کرلیا جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی راحت مقدم ہے:

ذکر نمبر ۱۴: ایک بار اس احقر کے پاس ایک سرفراز نامہ آیا، جس میں القاب میں ''مخدوم ومکرم'' کے الفاظ تھے۔ میں بے حد شرمندہ ہوا اور میں نے عریضے میں اپنی اس خجلت کو ظاہر کرکے درخواست کی کہ ایسے الفاظ تحریر نہ فرمائے جایا کریں۔ اس کے بعد جو والا نامہ آیا پھر اس میں وہی الفاظ۔ آخر میں نے عرض کیا کہ میری درخواست منظور نہ ہونے سے معلوم ہوا کہ حضرت کو اسی میں راحت

ہے، گو مجھ کو کلفت ہو، مگر میں حضرت کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم سمجھتا ہوں، اب جو مرضی ہو اِختیار فرمایا جائے، میں گوارا کروں گا۔

ذکر نمبر ۱۵: کسی سے کسی خدمت کی فرمایش کرنے کی عادت نہ تھی، بلکہ اکثر مہمانوں کے لیے کھانا مکان سے اپنے ہاتھ میں لاتے اور خود کھلاتے۔

للّٰہیت:

ذکر نمبر ۱۶: ایک بار احقر کی درخواست پر مدرسۂ جامع العلوم کان پور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے، اور اَحقر کے بے حد اِصرار پر وعظ فرمانے کا وعدہ فرمایا۔ جامع مسجد میں وعظ شروع ہوا، جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے، میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا، جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں؟ مولاناؒ کی جوں ہی مولانا علی گڑھیؒ پر نظر پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ بہ وجہ ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے، انہوں نے دُوسرے وقت عرض کیا کہ ”یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا“۔

فرمایا: ”ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اِظہارِ علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے۔“

سبحان اللہ! یہ ہیں حقیقی کمالات!

کسرِ نفسی:

ذکر نمبر ۱۷: ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مراد آباد میں وعظ کی درخواست

کی گئی، بہت کچھ عذر کے بعد منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی:

"فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ"

کے ترجمے کا حاصل "بھاری" لفظ سے فرمایا۔ مجلس میں ایک پُرانے عالم تھے جو "محدث" کے لقب سے معروف تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا:

"اَشَدّ کا ترجمہ غلط کیا گیا، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں"۔

تو مولاناؒ بے ساختہ کیا فرماتے ہیں:

"حضرت! مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں، اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انہوں نے مانا نہیں، اب بہت اچھا ہوا حضرت کے اِرشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہو گئی اور بیان سے بچ گیا۔"

حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا کچھ پوچھنا نہیں۔ دانت پیستے تھے کہ یہ کیا لغو حرکت تھی، گو مولاناؒ کے ادب سے کچھ بول نہ سکتے تھے، مگر مولاناؒ نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت سکون کے ساتھ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا:

"حضرت! غلطی کی وجہ معلوم ہو جائے تو آیندہ احتیاط رکھوں۔"

انہوں نے کڑک کر فرمایا:

"اَشَدّ کا ترجمہ آپ نے اَثْقَل سے کیا، یہ کہیں منقول نہیں، اَضَرّ سے کرنا چاہیے۔"

مولاناؒ نے فرمایا:

"اگر کہیں منقول ہو تو؟"

انہوں نے کہا:

"کہاں ہے؟"

مولاناؒ نے فرمایا:

''حدیث وحی میں ہے: کسی نے پوچھا: كَيْفَ يَأْتِيْكَ الْوَحْىُ؟ جواب میں اِرشاد ہوا: يَأْتِيْنِى اَحْيَانًا مِثْلَ سَلْسَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهٗ عَلَىَّ اور ظاہر ہے کہ یہاں ''اَضرّ'' کے معنی ممکن نہیں، ''اَثْقَل'' ہی کے معنی صحیح ہو سکتے ہیں''۔

بس یہ سن کر ان کا تو رنگ فق ہو گیا، مگر مولاناؒ نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا، لیکن ان کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اپنی غلطی کا اِعلان فرما دیں (۱)۔

وذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَنِعْمَ مَا قِيْلَ:

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دل بری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری اند

حضرت گنگوہیؒ سے اِجازتِ حدیث کی خواہش:

ذکر نمبر ۱۸: یہ بھی بعض ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولاناؒ نے ارشاد فرمایا کہ بارہا حاضری گنگوہ کے وقت خیال ہوا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے حدیث کی اجازت کی درخواست کروں، مگر معاً ہی یہ خیال مانع آ گیا کہ اگر حضرت پوچھ بیٹھیں: ''تجھ کو آتا ہی کیا ہے جو حدیث کی سند مانگتا ہے؟'' تو کیا جواب دُوں گا؟ بس یہ سوچ کر چپ رہ گیا۔ اللہ اکبر! کچھ حد ہے تواضع کی؟

---

(۱) 'ذکرِ محمود'، مشمولہ ''تذکرۂ شیخ الہندؒ'' میں اس جگہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے جو حاشیہ لکھا ہے وہ یہ ہے: اس ذِکر [۱۷] میں جن بزرگ محدث کی طرف اشارہ ہے وہ رام پور کے مشہور محدث مولانا محمد شاہ رام پوری ہیں، واقعے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''مقالاتِ عثمانی'': ج ۲، از مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ص ۴۳-۴۴۳۔ (اعجاز)

نفاست پسندی اور سادگی:

ذکر نمبر ۱۹: جیسے شباب میں لطافتِ مزاج کے سبب نفیس پوشش مرغوب تھی، اب غلبۂ تواضع کے سبب اس قدر سادہ لباس اور جوتا، اور سادی ہی وضع اِختیار فرمائی تھی، جیسے مساکین کی وضع ہوتی ہے۔ وضع سے کوئی شخص یہ گمان نہ کرسکتا تھا کہ آپ کو کسی قسم کا بھی امتیازِ مالی، جاہی، علمی حاصل ہے۔ حال آں کہ ع

آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

اِمامت سے گریز:

ذکر نمبر ۲۰: میں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا کہ آپؒ نے کبھی اِمامت فرمائی ہو۔

ہاں بھائی! یہ عیب تو میرے اندر بھی ہے:

ذکر نمبر ۲۱: میرے سامنے کا قصہ ہے کہ مدرسۂ عالیہ دیوبند میں اہلِ علم کا ایک خاص جلسہ تھا، جس میں اس پر کلام ہورہا تھا کہ آج کل طلبا اکثر بد اِستعداد کیوں ہوتے ہیں؟ اور سب متفقاً اس کا سبب طلبا کی کوتاہیوں کو بتلا رہے تھے۔ مثلاً: مطالعہ نہ دیکھنا، سمجھ کر نہ پڑھنا، اپنی رائے سے سبق شروع کردینا، سبق چھوڑ دینا، وَمثل ذٰلک!

ایک صاحب جو کسی مدرسے میں مدرّس تھے اور حضرت مولاناؒ کے شاگرد بھی تھے اور طبعاً ذرا دلیر تھے، بے ساختہ بول اُٹھے کہ کیوں حضرات! سب طلبا ہی پر اِلزام ہے، مدرّسین کی کوئی خطا نہیں؟ حضرت مولاناؒ نے فرمایا: ''ہاں بھائی! وہ تم بتلاؤ!'' وہ بولے: کیا یہ مدرّسین کی غلطی نہیں ہے کہ کسی طالبِ علم نے کوئی بات پوچھی، بجائے اس کے کہ شفقت سے اس کا شبہ رفع کریں، جھاڑ کی طرح اس کے پیچھے لگ گئے اور اِلزامی جوابوں سے اس کے سر ہوگئے۔ وہ بے چارہ خوف

زدہ ہوکر چپ رہ گیا اور وہ شبہ جوں کا توں رہ گیا۔ تو اس فن میں کیا اِستعداد ہو؟ تو مولاناؒ کیا فرماتے ہیں: ''ہاں بھائی ہاں! سچ کہتے ہو، یہ عیب تو میرے اندر بھی ہے۔'' وہ بے چارے بے حد شرمندہ ہوئے کہ حضرت! واللہ جو میرا یہ مقصود ہو؟ نعوذ باللہ! حضرت کو تھوڑا ہی کہتا ہوں۔ ہنس کر فرمانے لگے: ''تم نہ کہو، مجھ کو تو معلوم ہے، میں تو کہتا ہوں۔''

کمالِ صبر و برداشت:

ذکر نمبر ۲۲: بعضے درشت و نادرست مزاج طلبا درس میں بہت ہی بے ادبی کے الفاظ کہہ ڈالتے تھے، مگر حضرت مولاناؒ کو کبھی اس پر تغیر نہیں ہوا۔ اس وقت کوئی خاص قصہ ذہن میں حاضر نہیں۔

مکاتیبِ حضرت مولانا رحمہ اللہ

ذکر نمبر ۲۳: یہ میری کوتاہی ہے یا کم ہمتی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکاتبت (خط و کتابت) کا بہت ہی کم اِتفاق ہوا، اور جو بعض اوقات اس کی نوبت بھی آئی اور اس کا جواب بھی بالالتزام عطا ہوا تو ان کی حفاظت کا کچھ اِلتزام نہیں ہوا۔ اس وقت کل تین والا نامے محفوظ یاد آتے ہیں، ایک تو تفسیر کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے، جو تتمہ جلد رابع فتاویٰ اِمدادیہ: ص ۳۲۶ میں مطبوع ہوگیا ہے(۱)، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے، اور دو معمولی مضمون کے

(۱) حضرت تھانویؒ نے جس مکتوب کا ذکر فرمایا ہے وہ یہ ہے:

اَز احقر محمود عفا عنہ

بہ خدمت گرامی مکرمی جناب مولانا مولوی اشرف علی صاحب زید مجدہم ودام شرفہم

تسلیمات وتحیاتِ مسنونہ کے بعد عرض ہے: الـزانیـہ کے تقدم اور السـارقـہ کے تأخر کی نسبت چوں کہ بالتصریح حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ سے کوئی بات سنی ہوئی بندے کو یاد نہیں، اس لیے کچھ جواب دینے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اہلِ تفاسیر کے ارشادات جناب کو مجھ سے زاید معلوم ہیں، پھر فرمایئے عرض کروں تو کیا کروں؟

البتہ ملا کی تعریف میں داخل ہونے کی نیت سے یہ عرض ہے کہ سارق اور سارقہ فعل سرقہ میں ہر ایک مستقل ہے۔ ایک کے فعل میں دُوسرے کو دخل نہیں، بہ خلاف فعل زنا کے کہ فعل واحد دونوں کا محتاج ہے، کسی کو مستقل نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے سارق کو مقدم فرمانا تو محل خلجان نہیں ہوسکتا کہ رجال اشرف اور اَقویٰ ہونے کی وجہ سے تقدیم کے مستحق ہیں۔ چناں چہ آیاتِ قرآنی میں یہ تقدیم جابہ جا موجود ہے، حتیٰ کہ صرف رجال پر اکثر مواقع میں اَحکام وخطابات جاری فرمائے جاتے ہیں، اور نساء کا ذکر تک بھی نہیں فرماتے، تبعاً نساء کو داخل کرنے پر اِکتفا کیا جاتا ہے۔

←

← البتہ باعثِ خلجان یہ ہے کہ خلاف قاعدہ آیت سورۂ نور میں زانیہ کو مقدم ذِکر فرمانے کی کیا وجہ ہو؟ اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ بسا اوقات باعثِ تقدیم بے شک اولویت اور اَقدمیت ہوتی ہے، اسی کی وجہ سے رجال کو مستمراً مقدم کیا جاتا ہے، مگر کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی مصلحت کی رعایت سے ضعیف کو قوی پر مقدم کرنا عین حکمت وبلاغت سمجھا جاتا ہے۔ آیت: مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ میں وصیت کو دَین پر اسی وجہ سے مقدم فرمایا گیا۔ حال آں کہ دَین وصیت سے قوی ہے۔ جب کہ یہ مسلّم ہو چکا کہ تقدیم کبھی بہ وجہ قوت ہوتی ہے اور کبھی بہ وجہ ضعف، تو اَب یہ عرض ہے کہ مانحن فی بین زانیة کی تقدیم میں دونوں وجہ جاری ہو سکتی ہیں۔ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر چند فعل زِنا گو دونوں پر موقوف ہے، مگر اکثر اوقات یہی ہوتا ہے کہ محرکِ اوّل اس امر میں عورت ہی ہوتی ہے۔ کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے ایسے انداز وحرکات صادر ہوتے ہیں جو رِجال کو باعثِ رغبت وتہیج شوق ہو جاتے ہیں، بدوں (بغیر) اس کے کہ عورت کی طرف سے کسی قسم کی ادنا اعلیٰ تحریک ہو، وقوعِ زِنا نہیں ہوتا، یا ہو تو شاذ ونادر ہو۔ فقط!

زانیہ فرمانا مزنیہ نہ فرمانا بھی اس طرف مشیر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ عورت کو لباسِ زینت وخوش بو کے ساتھ گھر سے نکلنا یا اجانب کے قریب ہونا بھی منع ہوا، بہ خلاف رجال کے کہ ان پر یہ تشدد نہیں فرمایا گیا، اور عورت کے تحرک کے بعد رجال سے ضبط وصبر ہونا شاذ ونادر۔ یہی وجہ ہے کہ مرد کی طلب کو عورت بسا اوقات مسترد کر دیتی ہے، مگر طلب نساء کو رجال سے روکنا نہایت دُشوار اور نادر الوقوع۔ نظر بریں وجوہ نساء اس بارے میں اقویٰ اور اقدم ہیں اور لائق تقدیم۔

حضراتِ مفسرین کے ارشادات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ رجال اس امر میں فاعل ومختار وقادر ونساء منفعل ومجبور حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ تو رجال پر اِکراہ علی الزنا کو معتبر بھی نہیں فرماتے تو عورت کی جانب ضعیف معلوم ہوتی ہے، جس سے ممکن ہے کہ کسی کو اِجرائے حد زنا کا جو کہ اشد الحدود ہے نساء پر موجب رأفت ودرگزر ہو جائے۔ اس لیے نساء کو رجال پر مقدم فرمانا مثل تقدیم وصیة علی الدین مطابق حکمت وبلاغت ہو۔

نیز وجہ ثانی کی مؤید ایک وجہ وجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نساء کی نسبت زنا کی ادنا سی تہمت بھی نعوذ باللہ اس قدر موجبِ ننگ وعار ہے کہ اس کا تحمل معمولی آدمیوں سے تو کیا؟ خواص سے بھی سخت دُشوار۔ اب یہ الزام کسی عورت پر لگے اور حاکم کے رُو بہ رو جا کر سارے مراحل طے ہو کر علی الاعلان عورت پر حد زنا کو جاری کیا جاے۔ اللہ اکبر! اس قدر سنگین امر ہے کہ اولیائے مزنیہ تو درکنار تمام خاندان واہلِ قبیلہ واہلِ برادری کو بھی اس کا تحمل مالایطاق نظر آتا ہے، لا افضح قومی سائر الیوم شاہد بھی موجود ہے، اس لیے عورت پر حد زِنا جاری کرنے میں بالیقین سب ہی تساہل کریں گے، بلکہ مانع ہونے کو مستعد ہوں گے، تو اَب اجرائے حد میں ان کو مقدم فرمانا تقدم وصیة علی ←

ہیں، ان کو ذیل میں برکت کے لیے نقل کرتا ہوں۔ حضرتؒ کے مذاق تواضع وشفقت پر دلالت کے لیے یہ بھی دو شاہد عدل سے کم نہیں ہیں۔

مکتوب نمبر ا:

سراپا فضل وکمال شَرَّفَکُمُ اللہُ تَعَالٰی وَجَعَلَکُمْ فَوْقَ کَثِیْرٍ مِّنَ النَّاسِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

بارہا آپ کی خیریت معلوم ہونے کا داعیہ پیدا ہوا، اور ایک دو دفعہ بعض آیندگان کی زبانی آپ کی خیرت معلوم بھی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مع جملہ متعلقین خیریت سے رکھے۔ اس وقت ایک صاحب بنگالی مسمّٰی عبدالمجید سے ملاقات ہوئی جو ہندوستان واپس ہو رہے ہیں اور جناب کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں، یہ موقع غنیمت معلوم ہوا، اس لیے یہ عریضہ روانہ کرتا ہوں۔ بندہ مع رُفقا بحمد اللہ اس وقت تک بالکل خیریت اور اِطمینان سے ہے۔ شروع رجب میں مکہ معظّمہ حاضر ہو گیا تھا، اِس وقت تک یہیں حاضر ہوں۔ مجھ کو اُمید ہے کہ فلاح وحسنِ خاتمہ کی دُعا سے اس دُور افتادہ کو فراموش نہ فرمائیں گے۔ آیندہ قیام کی نسبت ابھی کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ مولوی شبیر علی صاحب(۱)، مولوی محمد ظفر صاحب، مولوی عبداللہ صاحب وغیرہ حضرات سے سلامِ مسنون فرما دیجیے۔

والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم

فقط بندہ محمود عفی عنہ

← الدین سے بہ درجہ زائد قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ واللہ سبحانہ اعلم، ولا حول ولا قوّۃ إلّا باللہ العلی العظیم (امداد الفتاویٰ: ج ۶ ص ۳۳۲-۳۳۴، کراچی)

(۱) ع: ذِکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے! (شبیر علی تھانوی)

مکہ معظمہ
۱۲/محرم، چہارشنبہ (بدھ)

منشی رفیق احمد صاحب کی خدمت میں سلام۔ خدا کرے ان کا رسالہ رُو بہ ترقی ہو۔

مکتوب نمبر ۲:

معدنِ حسنات وخیرات، دام ظلکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
نامۂ سامی موجبِ مسرّت وامتنان ہوا، جو ہوا کرمین و مخلصین کی ادعیۂ مقبولہ کا ثمرہ ہے، اَدَامَ اللّٰہ فیوضہم وبرکاتہم۔ احقر اور رُفقا و متعلقین بحمد اللہ خیریت سے ہیں، سب کا سلامِ مسنون قبول ہو۔ والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم، فقط!
بندہ محمود عفی عنہ، از دیوبند
دوم شوال، روز یک شنبہ (اتوار)

حق پرستی اور رعایتِ دِین:

ذکر نمبر ۲۴: حضرتؒ کے اِنصاف اور حق پرستی اور رعایتِ دِین کا نمونہ ایک قصے سے واضح ہوتا ہے۔ ایک قصبے میں ایک رئیس اور عالم کے یہاں، جو اپنے ہی مجمع کے ہیں، ایک تقریب تھی۔ احقر بھی اس میں مدعو تھا، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی اور دیگر حضرات بھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ رُسومِ بدعت میں سے کوئی رسم وہاں نہیں، اور کیوں کر ہوتی؟ جب کہ صاحبِ تقریب خود بدعت سے مانع تھے، مگر عام برادری کی دعوت تھی، جس کو میں بنا بر تجربہ رُسومِ تفاخر میں سے سمجھتا ہوں، اور جن اکابر پر حسنِ ظن غالب ہے وہ اس میں توسع فرماتے ہیں۔ چناں چہ اسی تفاوت کا یہ اثر ہوا کہ میں تو بلا شرکت واپس آ گیا اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی۔ خود اپنے ہی مجمع میں اس کا مختلف عنوانوں سے بڑا

غوغا ہوا، اور مجھ سے تو جب اس اختلاف کے متعلق کسی نے سوال کیا میں نے تو بزرگوں کے ادب کی رعایت ہی مدنظر رکھ کر جواب دیا، مگر عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی جو بعض نے سوال کیا تو باوجودے کہ حضرتؒ کے ذمے اس احقر کی رعایت کی کون (سی) ضرورت تھی، لیکن جو جواب عطا فرمایا اس میں جس درجے رعایت ہے وہ قابلِ غور ہے۔ وہ جواب یہ تھا کہ

> ''واقعی بات یہ ہے کہ عوام کے مفاسد کی جس قدر فلاں شخص (یعنی احقر) کو اِطلاع ہے ہم کو اِطلاع نہیں، اس لیے اس نے احتیاط کی۔''

حقیقت یہ ہے کہ ع

بریں نکتہ گر جاں فشانم روا ست!

یہ جواب مجھ سے بعض ثقات نے نقل کیا۔

گفتگو سے رائے نہیں بدلا کرتی:

ذکر نمبر ۲۵: اسی قصۂ مذکورہ متصلاً کی نظیر، اسی انصاف اور حق پرستی اور رعایت کا نمونہ یہ قصہ بھی ہے (اور اس وقت اسی پر اس ''ذِکرِ محمود'' کو ختم بھی کرُدوں گا) کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے تو بعض خاص اسباب سے بعض خاص معاملات میں بعض خاص خیالات ظاہر فرمائے اور اعلاماً وعملاً ان میں حصہ لیا، جس کا مبنیٰ محض خلوص کے ساتھ اسلام واہلِ اسلام کی خدمت تھی۔ چوں کہ وہ مسائل اِجتہادی تھے، جن میں شرعاً گنجایش اختلاف کی ہوتی ہے، اور ان میں بعضے پہلو دُنیوی ودِینی خطرات بھی رکھتے تھے، جو شرعاً واجب التحرز تھے۔ بعض اہلِ علم نے ان خطرات ومضرات پر نظر کر کے ان تحریکات میں رائیاً وعملاً شرکت نہیں کی، اور احقر کا خیال بھی ان ہی علاحدگی رکھنے

والوں کے موافق تھا، اور اس علاحدگی کو اکثر اہلِ محبتِ مفرطہ نعوذ باللہ حضرتؒ کی مخالفت سمجھتے تھے، مگر خود حضرتؒ کی یہ کیفیت تھی کہ جب میں زیارت کے لیے دیوبند حاضر ہوا تو میرے ساتھ میرے ایک دوست بھی تھے، جو ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، وہ مجھ سے کہتے تھے: میں نے حضرتؒ سے عرض کیا: اشرف اس وقت آیا ہوا ہے، اگر ان اُمور میں گفتگو فرما لیجیے تو شاید رائے متفق ہو جائے؟ ارشاد فرمایا:

"نہیں، مناسب نہیں۔ جو شخص اپنا لحاظ کرتا ہو اس سے ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ نیز گفتگو سے رائے نہیں بدلا کرتی، واقعات سے بدلا کرتی ہے۔"

اللہ اکبر! اس انصاف ورعایت کی کچھ حد ہے؟

نیز ایک صاحب اسی مضمون کے متعلق کہتے تھے کہ وہ دیوبند حاضر تھے، بعض لوگ اس احقر کی شکایتیں ان معاملات میں کر رہے تھے۔ حضرتؒ نے سن لیا، فرمایا:

"افسوس! تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے ہو جس کو میں ایسا ایسا سمجھتا ہوں۔"

(یہاں بعض الفاظ میری شان سے بہت ارفع ہیں، اس لیے میں نے ان کو نہیں لکھا کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک)

اور یہ بھی فرمایا:

"میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے؟ میری ایک رائے ہے، سو اُس کی (یعنی احقر کی) بھی ایک رائے ہے، اس میں اعتراض وشکایت کی کیا بات ہے؟"

نیز بعضے لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان ہی تحریکات کی تقویت کے لیے

تھانہ بھون لانا چاہا اور درخواست کی، تو ایک شخص کہتے تھے کہ حضرتؒ نے یہ جواب دیا:

"وہاں فلاں شخص (یعنی احقر) موجود ہے، میرے جانے سے اس کو تنگی ہوگی۔ کیوں کہ موافقت تو اس کی رائے کے خلاف ہوگی اور عدم موافقت سے شرمائے گا، اس لیے وہاں نہیں جاتا(۱)۔"

سبحان اللہ، اللہ اکبر! میں تو اکثر اوقات اپنے بزرگوں کے ایسے کمالات پیش کر کے دُوسری جماعتوں کو خطاب کر کے کہتا ہوں: ؎

أُولٰئِكَ آبَائِيْ فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ
إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ

خاتمہ:

اب اس کو ختم کرتا ہوں اور حسرت کے ساتھ تاریخِ وفات سے اِطلاع دیتا ہوں کہ بہ تاریخ ۱۸/ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء یوم سہ شنبہ (منگل) رہ گذائے عالمِ بقا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

اس احقر نے محض سہولتِ یادداشت کے لیے ایک مادّہ تاریخ کا سوچا ہے، گو فصیح نہیں ہے، اور اس پر مصرعے بھی لگا دیے، گو شاعر نہیں ہوں۔ وھوھٰذا:

قطعہ

آہ حضرت شیخ محمود الحسن
راہیِ جنت شد از دار المحن

(۱) اسی طرح ایک موقع پر یہ اِرشاد فرمایا: "تم کیوں بار بار اس پر اِعتراض کرتے ہو؟ وہ بھی دِین کا ایک کام کر رہا ہے۔" (اشرف)

گفت ہاتف چوں بہ جستم سالِ او
واصل درگاہ جاناں ذُو المنن
۱۳۳۹ھ

اور حضرت رحمہ اللہ کے حاضر باش خواص سے اُمید رکھتا ہوں کہ اگر وقت ملے تو حضرتؒ کے کمالاتِ علمیہ وعملیہ کا مبسوط تذکرہ تحریر فرمائیں، خصوص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا حسین احمد صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ کی توجہ سے اس مقصود کی تکمیل میں بہت کچھ آسانی کی توقع ہوتی ہے۔

واللہ الفاتح لکل ابواب الخیرات وھو الموفق لإتمام الصّالحات!

کتبہ اردء تلامذہ صاحب التذکرۃ
الاحقر اشرف علی
رزقہ اللہ تعالی التّقویٰ والمغفرۃ
۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ
(۲۵ر جنوری ۱۹۲۱ء، بہ روز اتوار)

استدراک:

مکتوب (۳)

''ذکر ۲۳: میں مؤلف رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تین والا نامے یاد آتے ہیں۔
دو مرحوم کے سامنے تھے، درج کر دیے، تیسرے کا پتا بتا دیا۔ قارئین کرام
کی ضیافت طبع کے لیے تیسرا والا نامہ بھی تلاش کر کے یہاں درج کر دیا
جاتا ہے۔ ابھی تک کوئی اور والا نامہ دریافت نہیں ہوا۔ تیسرا مکتوب یہ
ہے:'' (ا.س.ش)

......☆......☆......

''از احقر محمود عفا عنہٗ

بہ خدمت گرامی مکرمی جناب مولانا مولوی اشرف علی صاحب زید مجدہم و دام شرفہم
تسلیمات و تحیات مسنونہ کے بعد عرض ہے الزانیہ کے تقدم اور السارقہ کے تاخر
کی نسبت چوں کہ بالتصریح حضرات اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ سے کوئی بات سنی ہوئی بندے
کو یاد نہیں۔ اس لیے کچھ جواب دینے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اہل تفاسیر کے ارشادات
جناب کو مجھ سے زاید معلوم ہیں، پھر فرمائیے عرض کروں تو کیا کروں؟ البتہ ملاّن کی
تعریف میں داخل ہونے کی نیت سے یہ عرض ہے کہ سارق اور سارقہ فعل سرقہ میں ہر
ایک مستقل ہے۔ ایک کے فعل میں دوسرے کو دخل نہیں بہ خلاف فعل زنا کے، کہ فعل
واحد دونوں کا محتاج ہے، کسی کو مستقل نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے سارق کو مقدم فرمانا تو محل
خلجان نہیں ہو سکتا کہ رجال اشرف اور اقویٰ ہونے کی وجہ سے تقدیم کے مستحق ہیں۔
چناں چہ آیات قرآنی میں یہ تقدیم جا بہ جا موجود ہے، حتیٰ کہ صرف رجال پر اکثر مواقع
میں احکام و خطابات جاری فرمائے جاتے ہیں اور نساء کا ذکر تک بھی نہیں فرماتے۔ تبعاً
نساء کو داخل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ باعث خلجان یہ ہے کہ خلاف قاعدہ آیت
سورۂ نور میں زانیہ کو مقدم ذکر فرمانے کی کیا وجہ ہو؟ اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ بسا

اوقات باعث تقدیم بے شک اولویت اور اقدمیت ہوتی ہے، اسی کی وجہ سے رجال کو مستمراً مقدم کیا جاتا ہے۔

مگر کبھی یہ بھی ہوتا ہے کسی مصلحت کی رعایت سے ضعیف کو قوی پر مقدم کرنا عین حکمت و بلاغت سمجھا جاتا ہے۔ آیت:

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْ بِهٖ اَوْ دَيْنٍ

میں وصیت کو دین پر اسی وجہ سے مقدم فرمایا گیا۔ حال آں کہ دین وصیت سے قوی ہے۔ جب کہ یہ مسلم ہو چکا کہ تقدیم کبھی بہ وجہ قوت ہوتی ہے اور کبھی بہ وجہ ضعف ،تو اب یہ عرض ہے کہ مانحن فی بین زانیہ کی تقدیم میں دونوں وجہ جاری ہو سکتی ہیں، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر چند فعل زنا گو دونوں پر موقوف ہے مگر اکثر اوقات یہی ہوتا ہے کہ محرک اول اس امر میں عورت ہی ہوتی ہے، کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے ایسے انداز و حرکات صادر ہوتے ہیں جو رجال کو باعث رغبت و تہیج شوق ہو جاتے ہیں، بدوں اس کے کہ عورت کی طرف سے کسی قسم کی ادنا اعلا تحریک ہو وقوع زنا نہیں ہوتا، یا ہو تو شاذ و نادر ہو فقط۔ زانیہ فرمانا مزنیہ نہ فرمانا بھی اس طرف مشیر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ عورت کو لباس زینت و خوش بو کے ساتھ گھر سے نکلنا یا اجانب کے قریب ہونا بھی منع ہوا، بہ خلاف رجال کے کہ ان پر یہ تشدد نہیں فرمایا گیا، اور عورت کے تحرک کے بعد رجال سے ضبط و صبر ہونا شاذ و نادر۔ یہی وجہ ہے کہ مرد کی طلب کو عورت بسا اوقات مسترد کر دیتی ہے، مگر طلب نسا کو رجال سے روکنا نہایت دشوار اور نادر الوقوع، نظر بریں وجوہ نسا اس بارے میں اقویٰ اور اقدم ہیں اور لایق تقدیم۔

حضرات مفسرین کے ارشادات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ رجال اس امر میں فاعل و مختار و قادر و نسا منفعل و مجبور حتیٰ کہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ تو رجال پر اکراہ علی الزناء کو معتبر بھی نہیں فرماتے تو عورت کی جانب ضعیف معلوم ہوتی ہے، جس سے ممکن ہے کہ کسی کو اجرائے حد زنا کا جو کہ اشد الحدود ہے نسا پر موجب رافت و درگذر ہو جائے، اس لیے نسا کو رجال پر مقدم فرمانا مثل تقدیم وصیۃ علی الذین

مطابق حکمت و بلاغت ہو، نیز وجۂ ثانی کی مؤید۔

ایک وجہ ُوجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نسا کی نسبت زنا کی ادنا سی تہمت بھی نعوذ باللہ اس قدر موجب ننگ و عار ہے کہ اس کا تحمل معمولی آدمیوں سے تو کیا خواص سے بھی سخت دشوار۔ اب یہ الزام کسی عورت پر لگے اور حاکم کے رو بہ رو جا کر سارے مراحل طے ہو کر علی الاعلان عورت پر حد زنا کو جاری کیا جائے۔ اللہ اکبر! اس قدر سنگین امر ہے کہ اولیاے مزنیہ تو درکنار تمام خاندان و اہل قبیلہ و اہل برادری کو بھی اس کا تحمل مالایطاق نظر آتا ہے۔ لاافصح قوی سائر الیوم شاہد بھی موجود ہے، اس لیے عورت پر حد زنا جاری کرتے میں بالیقین سب ہی تساہل کریں گے، بلکہ مانع ہونے کو مستعد ہوں گے، تو اب اجراے حد میں ان کو مقدم فرمانا تقدم وصیت علی الدین سے بہ درجہا زاید قابل قبول ہونا چاہیے۔ واللہ سبحانہ اعلم ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم!

(امداد الفتاویٰ: ج ۶، ص ۳۴۴-۳۴۲)